اخبار امت

عراقی مسلمانوں کی حالت زار

رمزی براؤد

ترجمہ: مسلم سجاد

بغداد کی گلیاں خوانچہ فروشوں اور ٹیکسیوں کے ساتھ ساتھ ایک بے لچک جذبے سے بھی بھری نظر آتی ہیں۔ غیر معمولی افراط زر اور منجمد تنخواہوں کی وجہ سے عراق کے بیشتر محنت کشوں نے اپنی روزی کمانے کے لیے متبادل ذرائع تلاش کر لیے ہیں۔ جب سے مغرب نے عراقی معیشت کو دم گھوٹ کر تباہ کرنے کے لیے پابندیاں لگائی ہیں' افراط زر میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔

ایک ٹیکسی ڈرائیور' علی جو سابق فوجی ہے' ۱۵ گھنٹے روزانہ ٹیکسی چلا کر اپنے دس افراد کے خاندان کو سہارا دیتا ہے۔ اس نے مجھے اپنے سر پر لگے ہوئے گولیوں کے دو نشان دکھائے۔ حکومت نے اسے فوج سے فارغ کر دیا اور ۵۷۵ عراقی دینار ماہانہ پنشن مقرر کی۔ ایک وقت تھا کہ اس سے علی کی تمام ضروریات پوری ہو جاتی تھیں اور کچھ رقم بچتی بھی تھی۔ وہ کہتا ہے کہ اب میں یہ پیسے لینے جاتا بھی نہیں۔ آنے جانے کا خرچ اور وہاں کا انتظار اس سے زیادہ مہنگا پڑتا ہے۔

پابندیوں سے قبل عراقی دینار ۳.۳ امریکی ڈالر کے برابر تھا۔ اب ایک امریکی ڈالر ۱۹۷۵ دینار کے برابر ہے۔ ایک معمولی عام ہوٹل میں چائے کا کپ ۲۵۰ دینار میں ملتا ہے' یعنی علی کی نصف ماہانہ پنشن کے برابر۔

ایک مقامی صراف کو میں نے ۲۵ ڈالر دیے۔ اس نے مجھے دینے کے لیے ۵۰ ہزار دینار گنے تو میں پریشان سا ہو گیا۔ میں اپنے بیگ میں ان نوٹوں کو بمشکل رکھ سکا۔ کلرک نے ہنستے ہوئے کہا کہ انھیں گن لیں۔ میں نے بھی ہنستے ہوئے جواب دیا: "کوئی بات نہیں' انھیں گننے کے لیے میرے پاس پورا دن نہیں ہے"۔ باہر نکلتے ہوئے میں نے ۲۵ دینار کا عراقی نوٹ زمین پر پڑا دیکھا۔ گزرنے والے حتیٰ کہ بچے بھی اسے

نظرانداز کر رہے تھے۔ اس کی کوئی قیمت نہ تھی۔

وہ عراقی خوش قسمت ہیں جنھوں نے ابھی تک اپنے اثاثے فروخت نہیں کیے۔ کم خوش قسمت' اپنی تقریباً ہر چیز بیچ چکے ہیں۔ پابندیوں کے ابتدائی دنوں میں' ٹیلی وژن اور اسٹریو فروخت ہوئے' پھر فرنیچر کی باری آئی۔ پابندیوں کے ہر مرحلے میں کچھ خاص قسم کی اشیا عراق کی سڑکوں پر فروخت کے لیے آتی رہیں۔ اب لوگ اتنے پریشان ہیں کہ اپنی کتابیں اور کپڑے بھی بیچ رہے ہیں۔

المتنبی اسٹریٹ پر ہر طرح کی کتابیں فروخت ہو رہی ہیں۔ پرانی کتابیں' رسالے' سبھی چیزیں موجود ہیں۔ خریدنے والوں سے زیادہ بیچنے والے ہیں۔ جارج بش کا عراق کو پتھروں کے عہد تک پہنچانے کا وعدہ حقیقت سے قریب تر ہوتا جارہا ہے۔

۸۰ کے عشرے کے اواخر میں' عراق نے ۵۰ لاکھ تارکین وطن کو خوش آمدید کہا اور ان کو ملازمتیں فراہم کیں۔ اب عراق کے پاس اپنی آبادی کے لیے بھی روزگار نہیں ہے بلکہ خوراک بھی نہیں ہے۔ بڑے شہروں میں بے روزگاری کی شرح ریکارڈ سطح تک پہنچ گئی ہے۔ مڈل ایسٹ کونسل آف چرچ کے سربراہ مائیکل نہل کے مطابق' عراق کی دو تہائی افرادی قوت (work force) غیرپیداآور ہے۔ اس کی وجہ سستی و کاہلی نہیں بلکہ کام کرنے کے لیے وسائل کا نہ ہونا ہے۔ خام مواد' سرمایہ اور نقل و حمل کے نہ ہونے کی صورت میں عراقی معیشت کے لیے نیچے جانے کے علاوہ کوئی راستہ نہیں۔

بغداد میں زیادہ تر یونی ورسٹی گریجوایٹ ٹیکسیاں چلا رہے ہیں۔ لیکن علم کی پیاس ہے' اس لیے عراق کے کالج اور اسکول کھلے ہوئے ہیں۔ نوجوانوں کے چہروں پر امید ہی امید نظر آتی ہے۔ عراقیوں کے پاس ایمان کے علاوہ ہر چیز کی کمی ہے۔ جب بھی آپ کسی سے پوچھیں کہ تم اس سب کے ساتھ کیسے گزارا کر رہے ہو تو ہر دفعہ سب کی آنکھیں آسمان کی طرف اٹھ جاتی ہیں۔

بغداد کے ٹیکسی ڈرائیور حامد سے جو پولٹیکل سائنس میں ایم اے ہے' میں نے پوچھا کہ تمھارے خیال سے اس شہر کا مستقبل کیا ہے؟ اس کا جواب ایک نمایاں مسکراہٹ تھی! ایک ثانیے کے لیے میں اس کی اہمیت محسوس نہ کر سکا۔

جب ہم دریاے دجلہ پر پل آزادی سے گزرے تو اس نے کہا کہ امریکہ سے جنگ کے دوران اس پل پر تین دفعہ بمباری ہوئی۔ یہ کئی حصوں میں ٹوٹ کر دریا میں گر گیا۔ ہم نے انتہائی محدود ذرائع سے اس کو بہت جلدی تعمیر کر لیا۔ اس نے زور دے کر کہا: "دیکھو' یہ پہلے سے اچھا نہیں ہے؟" میں نے دریاے دجلہ پر فخر اور وقار کے ساتھ کھڑے اس عظیم الشان پل کو دیکھا' تب میں سمجھا---!

صدام ٹیچنگ ہسپتال میں ڈاکٹر جسیم محمد نے افسوس کے ساتھ کہا: "ہمارے پاس کچھ نہیں ہے"۔ اس نے ہسپتال کے بھرے ہوئے کمروں اور برآمدوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: "یہ تو ایک ہسپتال بھی

نہیں لگتا' یہ تو ایک پرانے اور گندے مکان کی طرح ہے۔ پیسہ نہیں ہے۔ مریض ایک دوسرے کے اوپر سو رہے ہیں۔ لوگ یہاں صحت نہیں موت حاصل کرنے آتے ہیں"۔

ڈاکٹر جسیم کے ساتھ ہم بچوں کے اس ہسپتال کی تیسری منزل تک خاموشی سے چلتے ہوئے پہنچے جہاں زیادہ تر بیمار بچے تھے۔ تعفن زدہ فضا نے ہمارا استقبال کیا۔ جب میں بڑے کمرے میں داخل ہوا جہاں ۱۵ بچے موت و زیست کی کش مکش میں مبتلا تھے تو مجھے بو کی اہمیت کا کوئی احساس نہ رہا۔

صوبہ الرمادی کا سات سالہ لڑکا' رائید محمد کے قریب جب میں گیا تو وہ مجھے شرمیلا سا لگا۔ اس کے چہرے پر موجود معصومیت نے مجھے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ کیا اسے معلوم ہے کہ اس کے ننھے سینے میں سرطان کا پھوڑا ہے؟ کیا وہ یہ بھی جانتا ہے کہ سرطان کیا ہوتا ہے؟ رائید خون تھوکتا ہے لیکن اسے اپنی بیماری کے مطابق مناسب علاج کی سہولت اور دوا میسر نہیں ہے۔ ڈاکٹر نے جب مجھ سے انگریزی میں کہا: چند دنوں کی بات ہے یہ چلا جائے گا--- تو رائید ہمیں دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ میں نے فوراً ہی پوچھا: کہاں چلا جائے گا؟ اس نے اپنے آنسو روکتے ہوئے کانپتی ہوئی آواز میں کہا: "ہسپتال کے اس حصے میں آ کر جہاں سب بچے چلے جاتے ہیں۔ وہ سب موت سے ہم کنار ہو جاتے ہیں!"

ہاجرہ عبداللہ ہم سے گفتگو کے لیے اپنی باری کے انتظار میں بڑی بے چین نظر آ رہی تھی۔ لیکن جیسے ہی میں نے اس سے اس کا نام پوچھا وہ شرما کر رہ گئی۔ وہ چار ماہ سے خون کی کمی کا شکار' زیر علاج تھی۔ اس کے قریب رکھی ہوئی سبز خالی میز گواہی دے رہی تھی کہ اسے کتنا علاج میسر ہے۔

میں نے ڈاکٹر معاذن سے پوچھا کہ ہسپتال مریضوں کو کیا فراہم کرتا ہے؟ اس نے بتایا کہ ہم جگہ دیتے ہیں اور دوائیں' اگر اس کے خاندان والے بلیک مارکیٹ سے خرید کر لا سکیں تو....! بچوں کی مائیں بطور نرس کام کرتی ہیں۔ وہ غذا لاتی ہیں اور لا سکیں تو دوائیں۔ جو مائیں دوا نہیں خرید سکتیں' اپنے پیارے بچوں کے پاس دن رات بیٹھی رہتی ہیں۔ وہ دیکھتی ہیں کہ ان کے جسم ڈھلکے ہوئے ہیں' ان کے لیے دعائیں کرتی ہیں' انھیں لوریاں دیتی ہیں' تاآنکہ بچے مرجاتے ہیں۔

جن ماؤں سے میری ملاقات ہوئی' ان میں سے ایک بغداد کی فرح تھی۔ فرح کی چار سالہ بیٹی علاہ کو گردن توڑ بخار ہے۔ کئی ماہ سے وہ ہسپتال میں ہے لیکن علاج کے لیے وسائل نہیں۔ جس وقت میں اس کے والدین سے ملنے کے لیے اس کی طرف جا رہا تھا' ایک چیخ اور پھر رونے کی آوازیں سن کر میں کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ علاہ کا انتقال ہو گیا تھا!

خوب صورت سرخ لباس میں ملبوس' کھلی آنکھوں کے ساتھ علاہ ایک چھوٹے بستر پر لیٹی ہوئی تھی' جب کہ اس کے گھر والے چاروں طرف بے بسی سے رو رہے تھے۔ علاہ کے دادا نے مجھ سے کہا کہ اس کی تصویریں لو۔ وہ کہہ رہا تھا کہ دنیا کو بتاؤ کہ ہمارے بچوں کے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟ دنیا کو بتاؤ کہ پابندیوں نے

ہمارا کیا حشر کر دیا ہے؟ اس نے علاہ کا برتھ سرٹیفکیٹ ہاتھ میں اٹھایا اور چیخ کر کہا: "انھوں نے اسے قتل کر دیا۔ امریکہ خوش ہے۔ اب وہ خوش ہو لیں۔ اب وہ جشن منا لیں۔ انھوں نے علاہ کو قتل کر دیا۔ انھوں نے میری اکلوتی پوتی کو قتل کر دیا"۔

ڈاکٹر محمد نے جو ۱۹۹۵ میں گریجوایشن کے بعد سے اسی ہسپتال میں کام کر رہے ہیں' مجھے بتایا: "جب کوئی بچہ مرتا تھا تو میں ہر مرتبہ روتا تھا۔ میں ان میں سے ہر ایک کا دوست ہوتا تھا۔ اب میں یہ نہیں کر سکتا۔ یا پھر مجھے روزانہ تین یا تین سے زیادہ دوستوں کا ماتم کرنا ہو گا"۔ جب بغداد کے سب سے بڑے ہسپتال کا یہ حال ہے تو آپ سوچ سکتے ہیں کہ چھوٹے ہسپتال کس طرح کام چلا رہے ہوں گے۔ جواب یہ ہے: "وہ کام نہیں چلا پا رہے۔ اسی لیے روزانہ بچوں کی بہت بڑی تعداد مر جاتی ہے"۔

ہسپتال کے دروازے کے پاس ایک آدمی اپنی جیکٹ بچھائے نماز پڑھ رہا تھا۔ جب میں اس کے قریب گیا تو میں نے اسے پہچان لیا۔ وہ خون کے سرطان سے مرنے والے ایک بچے کا باپ تھا۔ ہسپتال سے آنے کے بہت دیر بعد تک اس کی آواز میرے کانوں میں گونجتی رہی۔ اللہ اکبر... اللہ اکبر! (کریسنٹ انٹرنیشنل' ۱۶ تا ۳۱ مئی' ۱۹۹۹ سے ماخوذ)۔

مراکش: مسائل کا شکار

مسلم سجاد

مراکش امت مسلمہ کا ایک اہم ملک ہے جس کے بارے میں ہمارے ذرائع ابلاغ میں کبھی کبھار ہی کوئی خبر آتی ہے۔ ہم نہیں جانتے کہ وہاں کے ہمارے مسلمان بھائی کس طرح کی زندگی گزار رہے ہیں اور کن مسائل کا شکار ہیں۔

مراکش میں گذشتہ سال انتخابات کے بعد شاہ حسن نے حکومت بائیں بازو کی پارٹیوں کے حوالے کی۔ سوشلسٹ لیگ آف پیپلز فورسز (USFP) کے عبدالرحمٰن یوسفی وزیراعظم بنے۔ دوسرے مسلمان ملکوں کی طرح یہاں بھی سیاسی مخالفت برداشت نہ کرنے کی روایت رہی ہے۔ نئی حکومت آنے کے بعد توقع تھی کہ ماضی کے ظلم و جبر کا کچھ ازالہ کیا جائے گا۔ عبدالرحمٰن یوسفی کی حکومت کو ایک سال ہو چکا ہے۔ لیکن اس حکومت سے جو توقعات قائم کی گئی تھیں' بیشتر پوری نہیں ہوئی ہیں۔ بعض پولیس افسران کو قتل' ٹارچر اور عصمت دری کے الزام میں سزائیں ہوئی ہیں۔ کچھ ججوں کو بھی تنبیہہ کی گئی ہے لیکن محسوس کیا جا رہا ہے کہ حکومت سابق دور کے لوگوں کو کیفر کردار تک پہنچانے کے بجائے' ان سے مکالمے اور سمجھوتے کی راہ پر چل پڑی ہے۔ لوگ حیران ہیں کہ ان کی تحسین بھی کی جا رہی ہے۔